# خودگزشت کا ایک باب

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی صاحب قبلہ طاب ثراہ

سید العلماءؒ کا یہ مضمون پروفیسر علامہ علی محمد نقوی صاحب نے عنایت فرمایا، تحریر کافی حد تک مدھم تھی جسے کہیں کہیں پڑھنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ خیر مضمون چھپ کر قارئین کے سامنے ہے۔ کافی چھان بین سے کام لیا گیا لیکن یہ مضمون ہندوپاک کے اکثر رسائل وجرائد میں نہیں ملا ممکن ہے کہ یہ قیمتی مضمون ابھی منزل اشاعت سے نہ گزرا ہو۔ (اسیف جائسی)

## حضور نظام کی وفات اور اپنے خودگزشت حالات کی بنا پر میرے تاثرات

۱۴رشوال ۱۳۸۶ھ مطابق ۲۵رفروری ۱۹۶۷ء روز شنبہ۔ آج شام کو خبر ملی کہ حضور نظام دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ میرے مشاہدات کی عمراُن کے متعلق پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہیں ہے۔ مگراتنی مدت میں میرے دل ودماغ نے جو اثر لیا وہ یہ کہ وہ غیر معمولی نفس کے حامل ضرور تھے۔ سب سے بڑی خاص بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ کہ اس عمر کے آدمی اور پھر دنیاوی حیثیت سے اس مرتبہ کے شخص کا حالات کے بدلنے سے اپنے کو بدلنا اور پھر مختلف اشخاص کے ظرف کا اندازہ کرکے اپنے مزاج سلطنت یا تمکنت میں تبدیلی پیدا کرنا بہت بڑے قوت عزم اور ضبط نفس کا ثبوت ہے جس کے ساتھ مردم شناسی کا بھی بہت بڑا دخل ہے۔

یہ واقعہ ہے اسے چاہے کوئی اچھائی سمجھے یا برائی کہ مجھے رئیسوں سے وحشت ہوتی ہے اور رئیسوں سے مجھ سے نبھتی نہیں۔ اس لئے جب پہلی مرتبہ میرا حیدرآباد جانا ہوا اور حضور نظام کی مہربانیاں مجھ پر شروع ہوئیں تو اس سفر میں میرے محب خاص رضی الدین حیدر صاحب میرے ساتھ تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھ سے عام رئیسوں سے تو بنتی نہیں، پھر یہ ''ابوالرؤساء'' ان سے مجھ سے کیونکر بنے گی اور انھوں نے بھی تائیدی سکوت کیا۔ اس کے بعد اس پندرہ سولہ برس میں جیسا کہ بعد کے واقعات میں تفصیل آئے گی کئی مرتبہ میں نے سمجھ لیا کہ اب حضور نظام سے تعلقات قطع ہوگئے۔ اور یہ کہ میں نے انھیں خفا کردیا مگر وہ خفا نہیں ہوئے اور تعلقات قطع نہیں ہوئے۔ یہ کوئی میرا کارنامہ تھوڑی ہے۔ مجھے اگر یہ فن آتا ہی ہوتا تو میں کبھی ان کے مرتبہ سے بدرجہا کم کسی رئیس سے بھی نباہ سکتا۔ اسے یقینا انہیں کا کمال سمجھنا چاہئے کہ انھوں نے ذرا ہی سے میں مجھے پہچان لیا اور پھر میرے لئے اپنے کو مستقل طور پر بدل لیا۔ یہ کام ہر ایک کا نہیں ہے۔

مجھ سے مخالفت رکھنے والے بلکہ اجنبی لوگ بھی جو مجھے پہچانتے نہ ہوں ممکن ہے اسے صحیح نہ مانیں یا نہ سمجھیں مگر واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں جب حیدرآباد کی سرزمین ہر ایک کا قبلۂ مقصد تھی اور حضور نظام بحیثیت بادشاہ کے برسراقتدار تھے میں نے حیدرآباد جانے سے گریز کیا۔ حالانکہ مواقع ایسے پیدا ہوئے کہ میں جاسکتا تھا یا مجھے جانا چاہئے تھا مگر نہیں گیا۔

سب سے پہلے جب یادگار حسینی کی تحریک کی اشاعت کے لئے ہمارے یہاں سے وفود جارہے تھے۔ قیصر حسین صاحب، وکیل پروپیگنڈا سکریٹری تھے، اس وقت یہ مسئلہ زیرغور آیا کہ حیدرآباد کون جائے؟ میں نے مولوی لقا علی صاحب حیدری مرحوم کو منتخب کیا کہ حضور نظام ان کی تقریریں بھی سن چکے تھے اور ان کو کئی دفعہ ملاقات کا موقع بھی دے چکے تھے اور ان کے ساتھ طے ہوا کہ قیصر حسین صاحب جائیں۔ قیصر حسین صاحب نے اُن تعلقات کی بناء پر جو اُن کے والد شہنشاہ حسین صاحب وکیل مرحوم کے اور پھر خود اُن کے ناصر الملۃ اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے ساتھ تھے کہا کہ میں ناصر الملۃ سے حضور نظام کے نام خط لے لوں گا اور اسے لے کر جاؤں گا اور حضور نظام سے ملوں گا۔ سب سمجھے کہ ٹھیک ہے۔ یہ ان کے لئے بہت آسان بات ہے مگر جب انھوں نے جناب ناصر الملۃ سے جاکر عرض کیا تو ان کی توقع کے بالکل خلاف موصوف نے انکار فرمادیا اور ارشاد کیا کہ مولوی علی نقی صاحب خود جائیں تو میں نظام کے نام خط دینے کے لئے تیار ہوں اور کسی کے جانے کی صورت میں میں خط نہیں دوں گا۔ قیصر حسین صاحب کی بہت دل شکنی ہوئی۔ مجبوراً واپس ہوئے اور مجھ سے یہ جواب بیان کیا اور کہا خود آپ جایئے مگر میں نے کہا نہیں، میں تو نہیں جاؤں گا چنانچہ مولوی لقا علی صاحب (اللہ ان کے درجات عالی فرمائے) تشریف لے گئے اس حال میں کہ ان کا لڑکا ٹوریہ گنج اسپتال میں شدید بیماری کے عالم میں داخل تھا۔ چنانچہ ان کی غیبت ہی میں اس کا انتقال ہوگیا اور ان کے ساتھ قیصر حسین صاحب گئے۔ کئی دن حیدرآباد میں قیام ہوا۔ حضور نظام نے غالباً مولوی لقا علی صاحب کو ملاقات کا موقع بھی دیا مگر جو مقصد وفد کا تھا وہ پورا نہیں ہوا۔ ہمارے ادارہ کو حضور نظام کا تعاون حاصل نہیں ہوا۔ بس حیدرآباد میں بڑی شان کے ساتھ بعد میں یادگار حسینی کا جلسہ ہوا۔ وہ غالباً بغیر اس وفد کے گئے ہوئے بھی اخباروں میں دوسرے مقامات کے جلسوں کا حال پڑھ کر ہی ہوجاتا۔

پھر جب حیدرآباد میں یادگار حسینی کا جلسہ ہوا تو مقررین ہمارے یہاں سے مانگے گئے۔ اکثر جگہ یادگار حسینی کے جلسوں میں میں خود گیا مگر حیدرآباد نہیں گیا۔ سنی مقرر کی حیثیت سے مولانا صبغۃ اللہ صاحب فرنگی محلی کو منتخب کیا اور شیعہ مقرر کی حیثیت سے مولانا ابن حسن صاحب جارچوئی کو چنانچہ حضور نظام کے یہاں سے دونوں صاحبوں کو فیض بھی پہنچا۔ مولانا ابن حسن صاحب جارچوئی کے لئے تو ماہانہ ایک وظیفہ ہوگیا اور مولانا صبغۃ اللہ صاحب عزاخانۂ زہراء کے ذاکر خاص قرار دیئے گئے۔ جہاں سالہا سال جاتے رہے اور پھر ان کے لئے بھی ماہانہ وظیفہ جاری ہوا جس

کے لئے وہ عمر بھر اپنی محبت سے یہ اظہار فرماتے رہے کہ ان کی وجہ سے ہوا مگر میں حیدرآباد نہیں گیا۔

میرا نظریہ یہ رہا جس کا میں نے کبھی کبھی اظہار بھی کیا کہ جہاں کی دنیا فرد واحد میں منحصر ہو وہاں کبھی نہیں جانا چاہئے۔ یعنی بیان کو عوام میں کتنا ہی پسند کیا گیا ہو لیکن حضور نظام نے پسند نہیں کیا تو کچھ بھی نہیں اور اگر کسی نے براہ راست پسند نہیں کیا اور حضور نظام نے پسند کر لیا تو سب کچھ۔ پھر یہ کہ وہاں سے علماء کے وظیفے ہوتے رہے ہیں۔ اب وہاں گئے اور وظیفہ ہو گیا تو کہنے کو ہو گیا کہ بس اسی لئے گئے تھے۔ اور نہیں ہوا تو کہنے کو ہوا کہ بچارے گئے بھی پھر بھی وظیفہ نہیں ہوا تو ایسی جگہ کون جائے؟! بس! یہ بنیاد تھی کہ حضور نظام کے دور اقتدار میں میں حیدرآباد جانے سے ڈرتا رہا۔ یہاں تک کہ ورق پلٹا اور اب ماہانہ وظیفوں کا سوال ہی باقی نہیں رہا اور جن جن کے وظیفے تھے وہ بھی سب بند ہو گئے۔ اب اس کا تصور ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر میں گیا تو ایک اوسط درجہ کے عہدہ دار سرکاری یعنی نائب ناظم معدنیات کے یہاں جہاں حضور نظام سے کسی ربط کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب یہ بالکل قدرت کی طرف کی بات ہے کہ ربط ان سے قائم ہوا اور ایسا ہوا جو ان کی زندگی کے آخری نفس تک قائم رہا۔ اور دیا بھی انھوں نے مجھے اتنا جتنا اپنی پوری عمر میں خزانۂ حکومت سے بھی میری صنف کے کسی آدمی کو انھوں نے نہیں دیا ہوگا تو اس میں میرا کون ہنر ہے۔ یہ قدرت کی طرف کی بات ہے اور حضور نظام کی بصیرت اور عزیمت ہے جس میں اس طبقۂ اربابِ ثروت میں میں نے ان کو منفرد پایا۔

اچھا اب حیدرآباد جانے اور حضور نظام سے تعلقات کے آغاز کا حال سنیے:-

حیدرآباد سے میرے بلائے جانے کی تحریک اس وقت ہوئی جب پورے ہندوستان میں میرے خلاف شہید انسانیت والا محاذِ مخالفت قائم ہو چکا تھا۔ اس وقت وہاں ہمارے بزرگ دوست حکیم سید محمد عباس صاحب سرسوی تشریف فرما تھے اور بحیثیت طبیب بڑے سے بڑے حلقوں میں درخور اور اثر رکھتے تھے۔ انھوں نے وہاں کے لوگوں کو میرا مشتاق بنایا۔

پہلے ایک جماعت تیار ہوئی جس میں شہید یار جنگ اور کیپٹن سید محمد علی زیدی بھی شریک تھے مگر تاریخیں وغیرہ مجھ سے طے نہ ہو سکیں۔ غرض حساب پورا بنا نہیں۔

اس کے بعد نظام الدین صاحب نائب ناظم معدنیات تیار ہوئے ان کے والد سید صادق علی صاحب حیدرآباد میں ناظم پٹہ یعنی پوسٹ ماسٹر تھے اور یہ شہید یار جنگ سید مہدی علی صاحب کے حقیقی چچازاد بھائی بھی تھے اور ہم زلف بھی اور عمر میں ان سے بڑے تھے۔ پھر یہ کہ شہید یار جنگ کی صاحبزادی کا عقد ان کے بڑے بیٹے سید محمد مہدی صاحب کے ساتھ ہوا تو سمدھیانہ بھی ہو گیا مگر وہ حضور نظام کے یہاں تقرب کے درجہ پر پہنچے اور سید مہدی علی سے ''شہید یار جنگ'' ہو گئے اور یہ بس میر صادق علی صاحب رہے اس لئے یہ تو ان سے برتاؤ بس اپنے چھوٹے بھائی سید مہدی علی کا سا کرتے تھے اور وہ ان سے متوقع تھے کہ یہ انھیں شہید یار

جنگ سمجھیں۔ یوں اندرونی طور پر گھریلو اسباب اور بھی ہوسکتے ہیں مگر بظاہر بس یہ بات تھی کہ آپس میں ایک قسم کی اندرونی آویزش تھی اور نظام الدین صاحب کی کسی نمایاں کامیابی سے شہید صاحب خوش نہیں تھے مگر چونکہ وہ خود پہلی دفعہ میرے بلانے کے محرکین میں تھے لہٰذا بظاہر ان کو بھی نظام الدین صاحب کے اس پروگرام سے اختلاف ممکن نہ تھا لہٰذا ''بادل ناخواستہ'' سہی وہ بھی نظام الدین صاحب کے اس ارادہ میں مؤید رہے۔

حکیم صاحب کے سب ہی عمائد سے برادرانہ تعلقات تھے اس لئے میر صادق علی صاحب بھی انھیں بھائی کہتے تھے اور نظام الدین صاحب وغیرہ انھیں حکیم چچا کہتے تھے چنانچہ آج تک جب کہ انقلاب حیدرآباد کے اثرات سے متاثر ہوکر حکیم صاحب حیدرآباد کو چھوڑ کر اپنے وطن سرسی آگئے، نظام الدین صاحب جب انجمن وظیفہ سادات کے جلسہ میں شرکت کے لئے ادھر آتے ہیں تو حتّی الامکان حکیم چچا سے ملنے سرسی ضرور جاتے ہیں۔

چنانچہ حکیم صاحب ہی کے واسطہ سے مجھے خط لکھا گیا اور پہلی دفعہ تین دن ۱۳، ۱۴ و ۱۵ / جمادی الاولیٰ کی تاریخوں کا پروگرام طے پایا۔ چونکہ حیدرآباد کا پہلا سفر تھا تو رضی الدین حیدر صاحب اور میرے بھائی سید کاظم صاحب سلمہٗ میرے ساتھ گئے۔

ابھی تک حاشیۂ خیال کے کسی گوشہ میں بھی حضور نظام سے کسی تعلق کا تصور موجود نہ تھا اور بانی مجلس یا حیدرآباد کے دوسرے حضرات کے بھی ذہن میں حضور نظام کی شرکت مجلس کا تصور بھی بالکل نہ تھا اس لئے کہ حضور نظام کے جو عملی روایات قائم رہے تھے ان کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا بظاہر امکان ہی نہیں تھا۔ وہ اشخاص جن کے یہاں کی مجلس میں وہ شرکت فرماتے رہے وہ اس درجہ کے افراد ہوتے ہیں مثلاً سالار جنگ، مثلاً تہوّر جنگ، مثلاً بہرام الدولہ۔ ہمارے بانی مجلس کے والد ایک ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر، وہ خود ایک نائب ناظم معدنیات۔ لہٰذا دنیوی حیثیت سے یہ اس مرتبہ کے افراد میں داخل ہی نہیں جن کی منعقد کردہ مجلس میں حضور نظام کی شرکت ہوسکتی ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضور نظام کی شرکت جہاں ہوتی ہے وہاں بانی مجلس کی طرف سے ان کے پاس معروضہ جاتا ہے۔ اس معروضہ کی بنا پر وہ شرکت فرماتے ہیں۔ یہاں ہمارے بانی مجلس یا ان کے والد نے کوئی معروضہ حضور نظام کے پاس بھیجنے کی ہمت ہی نہیں کی ہے۔ اول تو اس لئے کہ یہ ان کی سطح سے بالاتر بات تھی جس کی ان کو خواہش ہی نہیں ہونا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ حقیقت میں وہ ان کی شرکت پسند بھی نہیں کرسکتے تھے۔ کیوں؟ وہ اس لئے کہ یہ بھی ایسی روایت تھی کہ اب تک کبھی ٹوٹنے کا تصور نہ تھا کہ جب حضور نظام مجلس میں شریک ہوجائیں گے تو اب ذاکر کا رابطہ حاضرین مجلس سے اور حاضرین کا رابطہ ذاکر سے کوئی نہیں رہتا تھا۔ اب ذاکر کے مخاطب صرف حضور نظام ہوں گے اور ذاکر کے بیان پر جو کچھ اظہار خیال کریں گے وہ بس وہی کریں گے۔ اہل مجلس دور سے بس دیکھنے والے ہیں کہ حضور نظام کیا اثر لے رہے ہیں۔ اس طرح وہ مجلس پھر ''مجلس'' رہ ہی نہیں جاتی تھی۔

۱۳ر جمادی الاول کو الاوہ سرطوق میں پہلی مجلس ہوئی۔ بڑا شاندار اجتماع تھا۔ ''اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ'' کے عنوان سے ضرورت مذہب پر آج کا بیان تھا جو ڈھائی گھنٹے جاری رہا اور بڑی کامیاب مجلس ہوئی۔

صبح کو کوئی دس بجے کا وقت ہوگا۔ میر صادق علی صاحب اور نظام الدین صاحب اور چند آدمی میرے پاس تھے کہ ایک جوان جسے حضور نظام کی ڈیوڑھی کی سی۔آئی۔ ڈی۔ کی قسم کے آدمیوں میں سمجھنا چاہیے آیا اور اس نے نظام الدین صاحب سے کہا کہ آج تو آپ کے یہاں اعلیٰ حضرت مجلس میں تشریف لائیں گے۔ نظام الدین صاحب بڑے جھلّے مزاج کے اور سخت قسم کے آدمی ہیں۔اسی لئے اکثر افراد ان سے ناراض رہتے ہیں۔انھوں نے اس آدمی کو ایک دم ڈانٹ دیا کہ یہ کیسی حماقت کی بات ہے۔اعلیٰ حضرت ہمارے یہاں کیوں آئیں گے۔ہمارے یہاں وہ آ ہی نہیں سکتے اور پھر ہم نے بلایا نہیں ہے۔معروضہ پیش نہیں کیا ہے تو وہ کیوں تشریف لائیں گے؟ اس بے چارے نے دبی زبان سے کہا کہ آپ ناحق خفا ہوتے ہیں۔ میرے سامنے کی بات ہے۔ پولیس وغیرہ کو انتظامات کے لئے احکام جاری ہو چکے ہیں۔مگر نظام الدین صاحب کو نہ ماننا تھا نہ مانے دوسرے لوگوں کو بھی یہ بات کوئی قرین عقل معلوم نہیں ہوئی۔

آج دوپہر کو ہماری دعوت اشرف الحکماء حکیم سید علی عرف ننھے صاحب آشفتہ کے یہاں تھی۔ یہ ہمارے خاندانی بزرگ تھے، جنھیں ہم کہتے تھے ''ننھے چچا''، مگر وہ رشتہ میں ہمارے دادا تھے کیونکہ غفران مآبؒ کے پانچ بیٹوں میں سے ایک مولانا سید حسن صاحب کے صاحبزادے سید حسن مثنّیٰ صاحب تھے اور ان کے بیٹے حکیم آشفتہ صاحب تھے۔اسی طرح جناب غفران مآبؒ کے ایک بیٹے سید العلماء مولانا سید حسین صاحب کے صاحبزادے جناب ممتاز العلماء سید تقی صاحب قبلہ اور جناب زبدۃ العلماء سید نقی صاحب تھے۔ جناب سید تقی صاحب کے صاحبزادے ہمارے دادا جناب سید ابراہیم صاحب تھے اور جناب سید نقی صاحب کی صاحبزادی ہماری دادی صاحبہ۔ اس طرح حکیم آشفتہ صاحب رشتہ میں ہمارے دادا اور دادی کے بھائی ہوتے تھے مگر چونکہ وہ عمر میں ہمارے ابا جان سے چھوٹے تھے اور ان کے شاگرد بھی تھے اس لئے وہ انھیں احتراماً ''ممّن بھائی'' کہتے تھے اور اس لحاظ سے ہم نے انھیں ''ننھے چچا'' کہا۔ ابّا جان ان سے خاص محبت رکھتے تھے اور وہ مجھ پر شفقت خاص رکھتے تھے۔

ہمارے ساتھ ہمارے میزبان نظام الدین صاحب اور ان کے والد ماجد میر صادق علی صاحب اور ''حکیم چچا'' (حکیم محمد عباس صاحب) بھی مدعو تھے۔ان کے علاوہ شہید یار جنگ اور کچھ دوسرے معززین کو بھی انھوں نے مدعو فرمایا تھا ہم لوگ پہنچے تو شہید یار جنگ اور حکیم آشفتہ صاحب وغیرہ اسی موضوع پر بات کر رہے تھے کہ آج اعلیٰ حضرت مجلس میں شریک ہوں گے۔

اب اس خبر کی جو صبح والی تھی تصدیق ہو رہی تھی۔ نظام الدین صاحب نے کہا کہ یہ کیونکر ہو گیا؟ صبح کو تو مجھے یہ

خبر ملی تھی تو میں نے سختی کے ساتھ اس کو غلط قرار دیا تھا۔ شہید صاحب نے کہا نہیں وہ بالکل صحیح ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ رات کی مجلس میں شریک ہونے کے بعد میں صبح کو جو ''ڈیوڑھی'' گیا تو اعلیٰ حضرت کا جیسے رات کی مجلس میں دل لگا ہوا تھا۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ تم مجلس میں شریک ہوئے تھے؟ میں نے اقرار کیا تو انھوں نے دریافت فرمایا کہ کیسا بیان ہوا؟ میں نے کہا حضور! بیان ایسا تھا جو بس اہل علم کے سننے کے قابل تھا۔ یہ سننا تھا کہ فرمایا: یعنی ہم اس بیان کو پسند کریں گے؟ میں نے کہا ''یقیناً۔ وہ سرکار ہی کی سماعت کے قابل ہے۔'' فرمانے لگے: ''تو اچھا۔ ہم آج شریک ہوں گے۔'' اور اسی وقت پولیس وغیرہ کو احکام جاری ہو گئے۔ چونکہ ابھی تک حضور نظام ریاست کے انضمام کے باوجود ''راج پرمکھ'' کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے ان کے کہیں جانے کے لئے سرکاری طور پر انتظام ضروری تھا۔

یہ سن کر ہمارے حکیم محمد عباس صاحب قبلہ نے تو گویا سر پیٹ لیا کہ بس آج کی مجلس گئی۔ شہید صاحب نے کہا کہ مجلس جائے یا رہے، اب ان کا تشریف لانا تو یقینی ہے اس لئے اس کے انتظامات پر غور کیجئے۔ چونکہ یہ بھی ایک نہ بدلنے والی روایت ہے کہ حضور نظام جس جگہ کبھی تشریف لا چکے ہیں جہاں پہلی مرتبہ بیٹھے تھے وہیں بیٹھیں گے۔

اب یہاں جن لوگوں نے نہیں دیکھا ہے انھیں الاوہ سرطوق کی جغرافیائی صورت کو ذہن میں لانے کی ضرورت ہے۔

یہاں ایک بڑے سے پھاٹک کے بعد ایک بہت کافی وسیع صحن ہے اور سامنے چند سیڑھیوں کی کرسی دے کر ایک دالان اور شہ نشین ہے جس میں چار پانچ در ہیں مگر عرض اس کا بہت کم ہے۔ شہ نشین میں وہ علم مبارک ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں ایک جز اس طوق کا ہے جو حضرت امام زین العابدینؑ کے گلوئے مبارک میں تھا اور اس مناسبت سے اس عزاخانہ کو الاوہ سرطوق کہتے ہیں۔ حضور نظام جب یہاں پہلے کبھی مجلس میں شریک ہوئے ہیں تو وہ بیچ کے در میں ستون سے لگ کر بیٹھے ہیں اور منبر اسی دالان میں بائیں طرف کی دیوار سے لگا کر رکھا گیا ہے۔ اب ہمارے یہاں مجلس میں چونکہ اجتماع بڑا ہوتا ہے اس لئے منبر کا صحن میں رہنا ضروری ہے۔ اگر منبر اوپر دالان میں رکھ دیا جائے تو ذاکر کا تعلق اس پورے مجمع سے جو صحن میں بیٹھا ہے بالکل قطع ہو جائے گا۔ اس پر غور کیا گیا اور یہ طے پایا کہ خود میر صادق علی صاحب الاوہ سرطوق تشریف لے جا کر مجلس کی ساخت اور منبر کے رکھنے کی جگہ وغیرہ پر غور کریں گے اور کوئی مناسب صورت تجویز کریں گے۔

کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ واپس ہوئے اور اب حسب قرارداد میر صادق علی صاحب اور نظام الدین صاحب الاوہ سرطوق گئے۔ میں بھی دیکھنے چلا گیا کہ کیا انتظام ہوتا ہے۔ انھوں نے ایک تو یہ کیا کہ پھاٹک سے لے کر دالان کے اس در تک جہاں حضور نظام جا کر بیٹھیں گے دو رڈوری بندھوا دی جو اس کی علامت تھی کہ یہ راستہ صاف رہنا چاہئے اور اس درمیان کی پٹی میں لوگوں کو نہیں بیٹھنا چاہئے۔ اس کے علاوہ منبر کو صحن ہی میں ذرا آگے بڑھا کر

رکھ دیا گیا تاکہ اس در کے سامنے رہے جس میں اعلیٰ حضرت تشریف فرما ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ایک حصہ مجمع کا تو ضرور منبر کے عقب میں ہوجاتا ہے مگر زیادہ حصہ منبر کے سامنے رہتا ہے۔ وہی جوان جس نے صبح کو سب سے پہلے حضور نظام کے آنے کی اطلاع دی تھی اس وقت پھر آ گیا اور اس نے اعتراض کیا کہ سرکار کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ منبر نیچے ہو اور وہ اوپر بیٹھیں (کیونکہ یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ وہ دالان کئی سیڑھیوں کی کرسی دے کر بنا ہوا تھا لہٰذا منبر اسی دالان میں اوپر رکھنا چاہئے۔ نظام الدین صاحب نے پھر یہ کہہ کر ڈانٹا کہ ہماری مجلس ہے۔ ہم جس طرح چاہتے ہیں منبر رکھتے ہیں۔ تم دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟ مگر میر صادق علی صاحب نے بڑھ کر مداخلت کی اور سمجھانے کے انداز میں اس شخص سے فرمایا کہ ہم یہاں منبر رکھتے ہیں۔ اگر اعلیٰ حضرت نے اعتراض فرمایا تو ہم اسی وقت منبر کو اٹھا کر جہاں وہ فرمائیں گے وہاں لے جا کر رکھ دیں گے۔

اگر پہلے سے لوگوں کو خبر ہوتی کہ آج حضور نظام آئیں گے تو مجمع ہی نہ ہوتا کیوں کہ لوگوں کو وہی خیال ہوجاتا کہ آج مجلس بشان مجلس نہیں ہوسکتی مگر یہاں تو پہلے سے کسی ذہن میں ان کے آنے کا احتمال ہی نہیں تھا۔ اس لئے مجمع ہوگیا اور درمیانی ڈوری کے ادھر اُدھر جتنی جگہ تھی وہ پُر ہوگئی۔ مجھے دس منٹ قبل آغاز مجلس کے وقت سے پہنچا دیا گیا اور میں منبر کے پاس اپنے مقام پر بیٹھ گیا۔

پانچ منٹ باقی تھے کہ خانہ زادوں کی جماعت جو سو کے قریب تھی سیاہ لباس میں داخل مجلس ہوئی۔ یہ کون ہیں؟ عرب وغیرہ جو فوجی افسر تھے ان کے بچوں کی حضور نظام براہ راست مثل اپنی اولاد کے پرورش کرتے ہیں۔ یہ ''خانہ زاد'' کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ منبر کے سامنے ذرا دور پر بیٹھ گئے۔ پھر عین شروع مجلس سے دو تین منٹ قبل مسلسل سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ اعلیٰ حضرت کی سواری قریب ہونے کی اطلاع ہے۔ اسی کے بعد دین یار جنگ، زین یار جنگ، شہید یار جنگ وغیرہ وغیرہ عمائد داخل ہوئے اور پھر کچھ شاہزادوں کے ساتھ حضور نظام آئے اور منبر کے سامنے سے تیز رفتاری کے ساتھ اُس خالی گزرگاہ میں سے ہوتے ہوئے اسی دالان پر پہنچ گئے اور سیدھے علم مبارک کے پاس جا کر پہلے اس کا بوسہ لیا اور پھر اپنی مقررہ جگہ پر آ کر جو بیچ کے در میں تھی ایک دفعہ نظر اٹھا کر منبر کے محل وقوع کو دیکھا اور بس بجائے اس کے کہ وہ کہیں کہ منبر وہاں کیوں رکھا ہے؟ وہ خود فوراً اتر کر منبر کے قریب آ کر مجمع کے درمیان بیٹھ گئے۔

بس یہ پہلی علامت تھی جس سے تمام مجلس نے محسوس کر لیا کہ آج حضور نظام نے اپنے میں تبدیلی پیدا کر لی ہے اور وہ اپنی انفرادی حیثیت کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ شریک مجلس ہوئے ہیں۔

پھر میرا طرز عمل یہ رہا کہ میں نے شروع سے لے کر آخر تک ایک مرتبہ بھی خاص طور پر اعلیٰ حضرت کی طرف نہیں دیکھا۔ نہ ان کو مخاطب بنایا۔ بالکل روز کے انداز کے مطابق پورے مجمع پر نظر رہی۔ اعلیٰ حضرت کا عالم یہ تھا کہ زانو پر ہاتھ مار مار کر بلند آواز سے تعریف کر رہے تھے اور کسی دفعہ چیخ کر کہتے تھے ''صلوات''، جس پر مجمع بھی تعریف

میں اور صلوات کے نعروں میں ان کا شریک تھا۔ کسی قسم کی مغایرت ان میں اور مجمع میں نہ تھی۔ بس اتنا میں نے لحاظ رکھا کہ بیان اتنا طولانی نہ ہو۔ اس لئے آج تقریباً سوا گھنٹے میں مجلس ختم کردی اور دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔

مجھ سے یہ پہلے سے کہا جاچکا تھا کہ آج اعلیٰ حضرت کے لئے دعا ہونا چاہئے اس لئے جب کہ عموماً ہم لوگ بعد مجلس اخفات کے ساتھ دعا مانگتے ہیں میں نے آج بآواز دعا شروع کی مگر اس طرح کہ ''خداوندا! تمام حاضرین کے مقاصد دینی و دنیوی کو برلا۔ خداوندا! ہم سب کو صراط مستقیم پر قائم رہنے کی توفیق کرامت فرما۔ خداوندا! ہمیں رسولؐ اور آل رسولؐ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔''

یہی وہ الفاظ ہیں جو ہمیشہ مسلمانوں کے مخلوط مجمعوں میں میں دعا کے موقع پر کہا کرتا ہوں۔

اب اس وقت ہمارے حکیم محمد عباس صاحب قبلہ کا اضطراب دیدنی تھا۔ وہ اپنی جگہ سے (مگر ایسی سمت میں جدھر اعلیٰ حضرت نہیں دیکھ رہے تھے) تقریباً نصف قد سے اُٹھ اُٹھ کر اعلیٰ حضرت کی طرف ہاتھ کر کر کے مجھے اشارہ کررہے تھے کہ ارے ان کے لئے دعا کیجئے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں بھول گیا یا اسے عمداً نظر انداز کرنا چاہتا ہوں۔ مگر میں ان کے اشاروں کو دیکھتے ہوئے ان دیکھا کئے ہوئے تھا اور میں نے اپنا سلسلہ یونہی جاری رکھا۔

''خداوندا! بانی مجلس کے مقاصد دینی و دنیوی کو برلا اور ان سے اس عمل خیر کو قبول فرما۔''

اس کے بعد میں نے کہا:

''خداوندا! اعلیٰ حضرت نظام دکن خَلَّدَ اللہُ رُتْبَتَہٗ کی مدد فرما، ان کے توفیقات خیر میں اضافہ فرما اور انھیں انصارِ آل محمدؐ میں شامل فرما۔''

یہ میرا کہنا تھا کہ حضور نظام نے بلند آواز سے کہا ''صلوات'' اور میں بس منبر کے نیچے تھا۔

اس کے بعد یہی الفاظ میری دعا کے خود حضور نظام کے یہاں کے محافل ومجالس میں بھی مقررہ ومعیّنہ طور پر جاری رہے یعنی ہمیشہ تمام حاضرین کے لئے دعائیں پہلے ہوئیں اور پھر حضور نظام کے لئے اور چونکہ ان میں بانی محفل یا مجلس بھی وہی ہوتے تھے، اس لئے انہی کے نام کے ساتھ ''بانی محفل'' یا ''بانی مجلس'' کی لفظ شریک کردی جاتی تھی اور پھر وہی توفیقات خیر کے اضافہ اور انصار دین وانصار آل محمدؐ میں شمول کی دعا اور اسی پر ختم۔

میرے منبر سے نیچے اترتے ہی مجمع اُٹھ کھڑا ہوا اور اسی رسی کے دونوں طرف سمٹ کر کھڑا ہوگیا اور نظام دکن اٹھ کر پہلے تو دوبارہ شہ نشین میں گئے اور پھر جا کر علم مبارک کو بوسہ دیا اور وہاں سے نکل کر منبر کے سامنے سے ''خوب خوب'' کہتے ہوئے گزر گئے۔

جس کو بات چیت کہنا چاہئے وہ میرے ان کے درمیان نہیں ہوئی۔

ان کے تشریف لے جانے کے بعد پھر سیٹیاں بجیں جو ان کے سوار ہوکر روانہ ہونے کی علامت تھیں اور پھر خانہ زاد جا کر اپنی سواریوں میں سوار ہوگئے اور دیگر اہل مجلس بھی مجلس سے گئے اس تاثر کے ساتھ کہ حضور نظام کی شرکت

کے ساتھ یہ آج پہلی مجلس ہوئی ہے۔ بانی مجلس اور ان کے تمام رفقاء خوش تھے کہ حضور نظام شریک بھی ہو گئے اور پھر مجلس فضائل و مصائب میں پوری کامیابی کے ساتھ ہوئی۔ ایک طرح کا احساس ان لوگوں کو اس طرح کا تھا کہ

رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گزشت اور گزشت

اس بنا پر کہ یہ معلوم تھا کہ حضور نظام کہیں ایک دفعہ سے زیادہ شریک نہیں ہوتے مگر دوسرا دن ہوا تو پھر صبح کو معلوم ہوا کہ آج پھر اعلیٰ حضرت تشریف لائیں گے۔

خیر اب یہ تو اطمینان ہو گیا تھا کہ ان کے آنے سے مجلس خراب نہیں ہوگی۔ پھر بھی یہ تعجب ضرور تھا کہ یہ اصول بھی کیونکر ٹوٹا؟

شہید صاحب تشریف لائے تو انھوں نے بتایا کہ میں جو صبح کو گیا تو سرکار نے فرمایا کہ میں نے ایسا بیان آج تک سنا ہی نہ تھا۔ اب میرا تو دل چاہتا ہے کہ آج پھر جاؤں۔ یہ مصاحبین جب محسوس کر لیتے ہیں کہ اس وقت رئیس خوش ہے تو پھر ہر بات کہہ گزرنے کی ہمت ہوتی ہے چنانچہ شہید صاحب نے کہا کہ سرکار! آپ کی تشریف آوری سے مجمع کا نقصان ہوتا ہے۔ گھبرا کے پوچھا کیا؟ تو انھوں نے کہا کہ پرسوں ڈھائی گھنٹے بیان ہوا تھا اور کل سرکار کی وجہ سے انھوں نے اختصار سے کام لیا اور سوا گھنٹے میں مجلس ختم کر دی۔ فرمایا نہیں ان سے کہہ دو کہ اختصار سے کام نہ لیں۔ میں اتنی ہی دیر بیٹھوں گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ فرمائش بھی ہوگئی کہ میں آج مسئلہ خلافت سننا چاہتا ہوں۔

عنوان کلام میرا دونوں مجلسوں میں اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ تھا۔ پہلے دن میں نے ضرورتِ مذہب اور خصوصیت دین اسلام بیان کی تھی۔ اور دوسرے دن مساوات اسلامی۔ آج تیسرے دن بھی میں نے اسی کو عنوان بیان قرار دیا مگر اس طرح کہ اسلام کے دو معنی ہیں ''سپردن'' اور ''سر بطاعت نہادن'' اور یہ دونوں باتیں ذات الٰہی سے متعلق ہیں اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ اسلام کے معنی میں مضمر ہے اللہ کے مقابلہ میں اپنے اختیارات کی نفی۔ اور اس کے بعد کسی فیصلہ یا انتخاب الٰہی کے مقابلہ میں انسانوں کا فیصلہ کوئی چیز نہیں رہتا۔ نہ انفرادی، نہ اجتماعی۔ اب خدا و رسولؐ کے انتخاب کا ثبوت۔ بیعت عشیرہ سے واقعۂ غدیر تک کے نصوص اور اس مجلس میں پہلی مرتبہ میں نے یہ جملہ کہا تھا کہ اب خدا و رسولؐ کے ان اعلانات کے بعد اجماع و شوریٰ کی کوئی گنجائش کہاں رہی۔۔۔۔۔ شور ہو رہا ہے۔ ''الکشن - الکشن'' اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جگہ تو خالی ہے ہی نہیں۔ الکشن کاہے کے لئے ہوگا۔

اعلیٰ حضرت کا آج عجیب عالم تھا۔ جوش میں تقریباً کھڑے ہوئے جا رہے تھے۔ آج میں نے اتنا اختصار تو نہیں کیا پھر بھی پونے دو گھنٹے میں مجلس ختم کر دی اور اب مثل سابق اعلیٰ حضرت علم مبارک کو بوسہ دے کر میرے سامنے سے خوب خوب کرتے ہوئے گزر گئے۔ کوئی بات چیت مجھ سے ان سے اب بھی نہیں ہوئی۔

ہاں میرے قیام کے آخری دن کے لئے اطلاع آگئی کہ صبح کو دس بجے موٹر آئے گی اور اعلیٰ حضرت کی ملاقات کو جانا ہوگا۔۔۔۔۔۔۔۔ چنانچہ دوسرے دن وقت معین پر

موٹر آئی اور ہم روانہ ہو گئے۔

حضور نظام کی سادگی کی کیفیت سنتے تو رہے تھے۔ اب آنکھوں سے دیکھ لی۔۔۔۔۔۔ پھاٹکوں تک تو حاجب و دربان سب تھے مگر ہدایت ہو گئی تھی کہ موٹر باہر نہ روکی جائے بلکہ اندر لے آئی جائے چنانچہ موٹر پھاٹکوں میں ہوتی ہوئی اس جگہ سے جہاں حضور نظام سے ملاقات ہوئی چند گز کے فاصلہ پر رک گئی۔ چوبدار نے جا کر اطلاع دی۔ اور پھر مجھ سے اترنے کو کہا۔ اتر کے آگے بڑھا تو وہ جیسے انتظار میں ٹہل ہی رہے تھے۔ اب نہ تزک تھا نہ احتشام۔ دو کرسیاں بچھی ہوئی تھیں لوہے کی۔ مصافحہ کر کے ایک پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ایک پر خود بیٹھ گئے۔ اس کے بعد پھر میری ملازمت، عراق کے قیام کی مدت، وہاں سے واپسی وغیرہ کے متعلق دریافت کرتے رہے۔ پھر علمائے لکھنؤ میں مختلف شخصیتوں کی قابلیتوں کے بارے میں سوالات ہوتے رہے جن کا سلسلہ اس کے بعد کی ملاقاتوں میں بھی عرصہ تک جاری رہا مگر بحمداللہ میں نے کبھی کسی اپنے مخالف کی بھی قدح نہیں کی۔ باختلاف مراتب ہمیشہ مدح ہی کرتا رہا۔

چونکہ کثرت سے مختلف حضرات کا ان ملاقاتوں میں ذکر آیا تو کبھی کبھی شخصیتیں ان کے ذہن میں مدغم ہو جاتی تھیں چنانچہ متعدد مرتبہ جناب مفتی احمد علی صاحب قبلہ کا تذکرہ ہوا۔ میں نے ان کی بزرگی اور فقاہت کا ذکر کیا۔ پھر ایک مرتبہ فرنگی محل کے علماء کا ذکر آیا۔۔۔۔ میں نے مفتی عبدالقادر صاحب اور ان کی سادگی کا ذکر کیا۔۔۔۔۔ مالی حیثیت کو دریافت کیا تو میں نے اسے ناقابل اطمینان بتایا۔

بعد میں انھوں نے شیراز میں وظیفہ کا اعلان کیا تو وہ دونوں تذکرے ان کے ذہن میں مدغم ہو گئے اور وظیفہ کا اعلان کرتے ہوئے نام جو شائع کئے وہ مفتی احمد علی صاحب فرنگی محل لکھنؤ اور اس کے ساتھ میرا حوالہ بھی کہ انھوں نے ان کا تذکرہ مجھ سے کیا۔ اب میں سمجھ گیا کہ واقعہ کیا ہے؟ میں نے انھیں مطلع کیا کہ جناب مفتی احمد علی صاحب قبلہ اور ہیں ان کا فرنگی محل سے کوئی تعلق نہیں اور فرنگی محل میں جو ہیں وہ مفتی عبدالقادر ہیں۔ چنانچہ اس کی تصحیح ہو گئی اور وہ وظیفہ مفتی عبدالقادر صاحب کو عمر بھر ملتا رہا۔

جہاں تک یاد ہے اس پہلی مرتبہ ملاقات میں علمی یا دینی مسئلہ کوئی زیر بحث نہیں آیا۔ مجالس کے سلسلہ میں اعلیٰ حضرت نے ''تین'' کے عدد پر اعتراض کیا اور کہا پانچ مجلسیں ہونا چاہئیں چنانچہ دوسرے سال سے ۱۱ سے ۱۵ تک پانچ مجلسیں ہونے لگیں جو بحمداللہ اب تک قائم ہیں۔

دوسرے سال از اول طے تھا کہ پانچ مجلسیں ہوں گی جن کا اعلان ہو گیا مگر حیدرآباد میں پہلے سے ایک عنصر میرے مخالفین کا موجود تھا جس میں مرکزی حیثیت مولوی علی محمد صاحب اجلال کی تھیں جنہیں میرے مرکز مخالفت سے ''خُسَر'' ہونے کی بنا پر رشتۂ خاص حاصل تھا۔ ان کی مخالفت پہلے سال میں انفرادی طور پر زبانی رہی یا مجالس میں عدم شرکت تک محدود رہی مگر اس پر غالباً مرکز سے عتاب ہوا کہ آپ کے ہوتے ہوئے وہ حیدرآباد گئے اور ان کی مجلسیں ہوئیں لیکن آپ نے کوئی کارنمایاں انجام نہیں دیا۔ اب اس سال انھیں اس کی تلافی کی فکر تھی چنانچہ انھوں نے اب اس

سال مقابل میں عملی مخالفت کا محاذ قائم کیا۔ اس کے لئے انھوں نے اپنے ساتھ ڈاکٹر شجاعت علی بیگ صاحب کو ملایا جو ایک مولوی قسم کے آدمی تھے۔ پہلے سال وہ مجالس میں شریک ہوئے تھے اور میرے پاس آ کر ملاقات بھی کی تھی مگر اس سال اجلالؔ صاحب کے ساتھ مل کر انھوں نے مجالس میں سدّ راہ ہونے کا بیڑا اٹھایا۔ ان کے ساتھ کچھ ایسے افراد شریک ہوئے جنھیں بانی مجلس سید نظام الدین صاحب سے پرخاش تھی اور وہ ان کی ایک طرح کی مقبولیت کو جوان مجالس کی بدولت ہوری تھی پسند نہ کرتے تھے۔ سمجھا جاتا ہے کہ شہید یار جنگ بہادر مرحوم بھی انہیں میں سے تھے اور در پردہ ان مخالفین کی پشت پناہی کر رہے تھے مگر چونکہ وہ خود حضور نظام سے وابستہ تھے اس لئے کھُل کر ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کر سکتے تھے۔

غرض محاذ قائم ہوا اور بڑی شدت سے جیسا ہندوستان میں کہیں نہیں ہوا یعنی مجلسوں بیری کیٹنگ کی گئی اور جلوس کی شکل میں لوگ الاوہ کے پھاٹک کے قریب لوگوں کا راستہ روک رہے تھے۔ پھر حیدرآباد کے ایک ضعیف العمر عالم مولوی برکت علی صاحب کو جو مجتہد سمجھے جاتے تھے لا کر اپنے جھنڈے کے نیچے کرسی پر بٹھالیا اور لوگوں کو ان کے تقدس کا واسطہ دے کر بھی روکا۔

حضور نظام تک یہ خبریں پہنچ رہی تھیں اور ان کی انتہائی برہمی اور غیظ وغضب کا باعث ہورہی تھیں۔ اس مرتبہ وہ شریک تو ہوئے ایک ہی مجلس میں یعنی آخری دن ۱۵ر جمادی الاول کو مگر اب کی ان کی طبیعت مخالفین کی حرکتوں پر بہت متنفّر تھی چنانچہ بعد ختم مجلس علم مبارک کو بوسہ دینے کے بعد جب وہ میرے سامنے سے گزرنے لگے تو ''خوب خوب' کہتے ہوئے گزرنے کے بجائے وہ ذرا رکے اور کہا ''یہ عالمانہ اور فاضلانہ بیان ہے۔ اس کو ''حشرات الارض'' بھلا کیا سمجھ سکتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ تشریف لے گئے اور دوسرے دن شہر بھر میں مخالف حضرات کے لئے ''کیڑوں مکوڑوں' ' کی لفظ استعمال ہورہی تھی جو گویا بادشاہ کا دیا ہوا لقب تھا۔

اس سال ایک واقعہ یہ رونما ہوا کہ انہیں تاریخوں میں پرنس معظم جاہ کے یہاں انوری بیگم سے جن کے ساتھ اعلیٰ حضرت نے اپنے اہتمام سے عقد کرایا تھا فرزند نرینہ کی ولادت ہوئی۔ چونکہ یہ تاریخیں ایک روایت کے مطابق جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کی وفات کی ہیں۔ حیدرآباد میں اسی روایت پر عمل ہے چنانچہ یہ ہماری مجلسیں نظام الدین صاحب کے یہاں کی بھی اسی سلسلہ میں ہوتی ہیں اس لئے ایّام عزا ہونے کی وجہ سے اعلیٰ حضرت کوئی خوشی کی تقریب ان دونوں میں نہیں کر سکتے تھے لہٰذا انھوں نے پیدا ہونے والے ''شہزادہ'' کے لئے ایک منّتی مجلس کی بنا قائم کی اور شہید یار جنگ کے ذریعہ مجھ سے خواہش کی گئی کہ یہاں کی مجلسوں کے اختتام کے بعد آپ یہ منّتی مجلس اعلیٰ حضرت کے یہاں پڑھ کر لکھنؤ روانہ ہوں جس کا میں نے وعدہ کرلیا۔ اس طرح ۱۶ر جمادی الاول کو سہ پہر کو یہ مجلس ہوئی اور شام کو میں حیدرآباد سے لکھنؤ کے لئے روانہ ہوا۔

وہ جملہ کہ ''حشرات الارض اس بیان کو کیا سمجھ سکتے ہیں'' اس سے جناب شہید صاحب نے اپنی ذہانت سے

میرے خلاف جو کام لیا وہ عجیب و غریب تھا جس کا تذکرہ اس کے بعد والے سال کے حال میں آئے گا۔ جہاں تک خیال ہے اسی موقع پر اعلیٰ حضرت نے اپنے یہاں عید غدیر کے لئے مجھ سے وعدہ لے لیا۔

نظام الدین صاحب کے یہاں کے پہلے سال کے سفر میں رضی الدین حیدر صاحب اور میاں کاظم سلمہٗ میرے ہم سفر تھے۔ دوسرے سال میرے چھوٹے بھائی میاں باقر سلمہٗ میرے ساتھ تھے۔

اب غدیر میں اعلیٰ حضرت کے یہاں کا پہلا سفر ہوا تو وہ اس اہتمام کے ساتھ کہ وہاں سے میجر حبیب نمائندہ خاص کے طور پر لکھنؤ بھیجے گئے تاکہ وہیں سے وہ میرے ہم سفر رہیں اور پھر رضی الدین حیدر صاحب اور میاں باقر سلمہٗ۔ یہ دونوں میری ہمراہی میں ۱۸/ذی الحج کو حیدرآباد پہنچے۔ سکندرآباد اسٹیشن پر شہید یار جنگ بہادر اور بعض ملازمین موٹر لئے ہوئے موجود تھے۔ وہ ہم کو ''عدن باغ'' لے گئے جو حضور نظام کے جائے قیام ''نذری باغ'' کے سامنے سڑک کے دوسری جانب واقع ہے۔

چونکہ اعلیٰ حضرت کو مخالفین کی سرگرمیوں سے بہت ڈرا دیا گیا تھا۔ اس لئے ''عدن باغ'' کے پھاٹک اور ہماری جائے قیام پر حفاظت کا زبردست انتظام تھا اور کسی کو ہم تک آنے یا ہم کو آزادی سے کہیں جانے کی اجازت نہ تھی۔

بے شک ایک دن میں نے خاص طور سے اطلاع دی اور وقت معین پر موٹر مع ڈرائیور اور ایک عدد ہمراہی کے آئی اور میں میر صادق علی صاحب اور شاعر اہلبیتؑ جناب نجم آفندی کی ملاقات کو گیا اور اس کے بعد سے یہ سنت قائم ہوگئی کہ ہمیشہ ایک دن وہاں کے قیام میں ان حضرات کی ملاقات کو نکلتا رہا۔ باقی نہ کہیں جانا اور نہ کسی کا وہاں آنا۔

ایک دن میاں باقر رضی الدین حیدر صاحب کی معیّت میں باہر گئے تو اعلیٰ حضرت کے یہاں سے ان کے یہاں کا خاص درزی ان کے قد کی ناپ لینے آیا تاکہ ان کے لئے لباس تیار کیا جائے۔ یہ موجود نہ تھے۔ اب تمام محافظین میں تلاطم پڑ گیا اور ان کا اضطراب دیکھنے کے قابل تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد یہ آ گئے تو گویا جان میں جان آئی اور اب ان لوگوں نے بھی توبہ کر لی کہ نہ نکلیں گے۔

سہ پہر کو غدیر کی محفل ہوئی جس میں میرا بیان ہوا۔۔۔۔ باقر صاحب سلمہٗ ہدایت خاص کے مطابق میرے ساتھ گئے تھے۔ رضی الدین حیدر صاحب کے لئے ہدایت نہ ہوئی۔ اس لئے انھیں میں اپنے ساتھ نہیں لے گیا۔

اس دفعہ وہاں سے باقر سلمہٗ کو خلعت یعنی لباس ملا اور ایک فاؤنٹن پین عنایت ہوا اور باقر کا خیال ان کے ذہن میں رہ گیا اگرچہ نام دھیان سے اتر گیا۔ اس لئے میاں کاظم سلمہٗ کے عراق جانے کی خبر انھیں ملی تو ان کے لئے تعلیمی وظیفہ مقرر ہوا اسی تصور پر کہ یہ وہ ہیں جو اس مرتبہ ساتھ آئے تھے۔

اب اس مرتبہ جو حیدرآباد سے واپسی ہوئی تو اس کے بعد حالات کی رفتار کچھ ایسی تھی کہ حضور نظام سے تعلقات کا قطع ہو جانا تقریباً یقینی ہو گیا تھا مگر یہ خدا کی قدرت تھی کہ تعلقات قطع نہیں ہوئے اور اسی کو میں تمام رؤساء میں حضور

نظام کی بلندی کا سب سے بڑا ثبوت سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ کوئی ان سے بدرجہا چھوٹا رئیس ہوتا تو اس کے اور اس کے خفا ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ مگر وہ خفا نہیں ہوئے بلکہ میری اور زیادہ عزت کرنے لگے۔۔۔۔ یہ ان کے ساتھ مخصوص چیز ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ پہلے آچکا کہ سال گزشتہ جمادی الاول کی مجلسوں میں مخالفین کی طرف سے محاذ قائم ہوا اور مجالس کو روکنے کی کوشش کی گئی۔ پھر یہ کہ حضور نظام نے آخری دن فرمایا کہ یہ عالمانہ وفاضلانہ بیان ہے۔ حشرات الارض اس کی قدر نہیں کرسکتے۔ بس ان دونوں باتوں سے فائدہ اٹھا کر جناب شہید صاحب نے اعلیٰ حضرت کے سامنے بڑے پرزور طریقہ پر اس چیز کو پیش کردیا کہ ان کا بیان اتنا اونچا ہے کہ عوام اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ نہ اس کی صحیح قدر کرسکتے ہیں اور پھر مخالفین ہر طرح کی تخریب کے درپے ہیں اور ان کے عام بیان میں بڑے خطرات ہیں لہٰذا جب تک ''شہید انسانیت'' کا ترمیم شدہ ایڈیشن شائع نہ ہوجائے ان کا بیان صرف سرکار کے یہاں ہونا چاہئے۔ عام جگہ پر ان کا بیان نہیں ہونا چاہئے۔

پھر یہ کہ یہ ایڈیشن شہید انسانیت کا خود سرکار کے ملاحظہ کے بعد سرکار کے زیر اہتمام شائع ہونا چاہئے۔

بس یہ دونوں باتیں اعلیٰ حضرت کے ذہن میں راسخ ہوگئیں چنانچہ جناب شہید صاحب ہوائی جہاز پر خاص اس پیغام کے حامل بنا کر میرے پاس بھیجے گئے۔

یہاں ''شہید انسانیت'' کی اشاعت کا حق میں پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی کو دے چکا تھا۔

شہید صاحب تشریف لائے اور اعلیٰ حضرت کا پیغام پہنچایا۔ میں نے جواب دیا کہ شہید انسانیت کی اشاعت کا حق تو میں مسعود حسن صاحب کو دے چکا ہوں اس لئے اب مجھے خود اس بارے میں کوئی اختیار نہیں رہا ہے اور نظام الدین صاحب کے یہاں مجالس کے لئے میں ان سے وعدہ کرچکا ہوں۔ اگر وہ اپنی مجلسیں ملتوی کردیں اور مجھے مدعو نہ کریں تو مجھے کوئی بحث نہیں۔

شہید صاحب نے کہا کہ آپ نے جو جواب دیا ہے اسے لکھ دیجئے۔ میں نے کہا کہ آپ زبانی پیغام لائے ہیں لہٰذا جواب بھی زبانی لے جایئے۔ اگر آپ خط لائے ہوتے تو جواب خط کے ذریعہ سے دیا جاتا۔۔۔۔۔ شہید صاحب رخصت ہوئے اور جا کر انھوں نے اعلیٰ حضرت کو روئداد اپنی لفظوں میں سنائی۔۔۔۔ کوئی شک نہیں ہے کہ ناگواری تو میرے جواب ہی سے پیدا ہوگئی ہوگی۔ اس لئے کہ حضور نظام اپنے کسی حکم پر ''نہیں'' سننے کے آج تک عادی ہی نہیں ہوئے تھے۔ تاہم ابھی یہ گنجائش تھی کہ میں نے نظام الدین صاحب کے یہاں اپنے نہ جانے کو خود نظام الدین صاحب پر محمول کیا تھا کہ اگر وہ مجلسیں نہ کریں گے تو میں نہ جاؤں گا۔

نظام الدین صاحب کو تو اعلیٰ حضرت ''بچہ'' سمجھتے تھے اس لئے ان سے تخاطب بھی کرنا منظور نہیں تھا۔ اس کے علاوہ شہید صاحب ممکن ہے نظام الدین صاحب کے متعلق اپنے رائے بتلا چکے ہوں کہ وہ ''بددماغ'' ہیں اور ''ضدی'' ہیں وغیرہ وغیرہ مگر ان کے والد میر صادق علی صاحب کی

سنجیدگی سے یہ امید تھی کہ وہ اعلیٰ حضرت کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں گے اور پھر اپنے بیٹے کو بھی اس کی تعمیل پر مجبور کر دیں گے چنانچہ اعلیٰ حضرت کے پاس سے میر صادق علی صاحب کے پاس اطلاع پہنچی کہ کل دس بجے دن کو شہید یار جنگ ایک ضروری گفتگو کے لئے آپ کے یہاں آئیں گے، منتظر رہئے گا۔ اب یہاں سے میر صادق علی صاحب کا خود بیان ہے کہ میں نے دل میں کہا کہ شہید یار جنگ میرے عزیز قریب کتنی دفعہ بلا اطلاع میرے پاس آجایا کرتے ہیں۔ ان کی آمد کے لئے اعلیٰ حضرت کی طرف سے اطلاع آئے! یہ اہمیت سے خالی نہیں اور پس اس کے بعد ہی میرے ذہن میں یہ آ گیا کہ یہ نظام الدین کی مجلسوں کے روکنے ہی کی غرض سے ہے اور بس اس کے بعد میں شش وپنج میں پڑ گیا۔ اعلیٰ حضرت کا کچھ فرمان ہو اور وہ ٹال دیا جائے! پھر اس کی مخالفت میں جو خطرات ہیں وہ سب ایک ایک کر کے دماغ میں گردش کرنے لگے۔ یہاں تک کہ فکر وتردد کی وجہ سے تقریباً پوری رات جاگ کر بسر ہوگئی۔ بالآخر نماز صبح کے وقت بعد نماز فریضہ میں نے قرآن سے استخارہ کیا تو آیت نکلی کہ ثابت قدم رہو اور اپنی جگہ سے جنبش نہ کرو۔۔۔۔۔ بس یہ دیکھتے ہی میرے قدموں میں ثبات پیدا ہو گیا۔۔۔۔۔۔ شہید صاحب آئے اور دس بجے سے ۲ بجے دن تک چار گھنٹے بیٹھے اور عزیز داری کا واسطہ دیتے ہوئے بطور نصیحت بھی اور اعلیٰ حضرت کی ترجمانی میں بطور تحکم بھی ہر طرح سے زور دیا اور جو نتائج ان کی اس ''ضد'' کے ہو سکتے تھے وہ سب بھی ہولناک طریقہ پر پیش کئے مگر میر صادق علی صاحب کسی طرح التوائے مجالس کے لئے تیار نہ ہوئے۔۔۔۔۔ آخر میں شہید صاحب نے کہا کہ اچھا جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں لکھ دیجئے۔ میں اعلیٰ حضرت کو دے دوں گا۔ میر صادق علی صاحب بلا تکلف تیار ہو گئے اور انھوں نے فوراً معروضہ لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ شہید یار جنگ نے مجھے اعلیٰ حضرت کا ارشاد پہنچایا اس سلسلہ میں میرے معروضات حسب ذیل ہیں:

(۱) میرا جان و مال، گوشت پوست سب اعلیٰ حضرت کا ہے مگر یہ مذہبی معاملہ ہے۔ اس میں مداخلت میں گوارا نہیں کر سکتا۔

(۲) یہ ہماری مجلس نذر کردہ ہے، اس لئے اس کا انجام دینا ہمیں ضروری ہے۔

(۳) ہم سے مولانا سے ہمیشہ کے لئے وعدہ ہے۔ وہ اپنے وعدہ سے تخلّف نہیں کر رہے ہیں تو ہمیں تخلف کرنا کیونکر جائز ہے؟

(۴) جن خطرات کا ان مجالس کے انعقاد کی صورت میں سرکار کو اندیشہ ہے ہم امید کرتے ہیں کہ وہ خطرات پیش نہیں آئیں گے۔

شہید صاحب اس خط کو لے کر گئے اور لے جا کر پیش کر دیا۔ بس اب اعلیٰ حضرت کے غیظ وغضب کی انتہا نہ تھی۔ گویا اپنا ملازم اور وہ اس طرح کا جواب دے!

اسی غصہ میں انھوں نے مجھے خط لکھا اور میر صادق علی صاحب کی اصل تحریر میرے خط کے ساتھ منسلک کی۔ یہ خط رجسٹری شدہ مجھے پہنچا جس کا مضمون یہ تھا کہ آپ کے منشا

کے مطابق میں نے میر صادق علی صاحب کو اپنی رائے سے مطلع کیا مگر انھوں نے جو جواب دیا وہ بعینہ اس خط کے ساتھ منسلک ہے۔۔۔۔۔اب معاملہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بہرحال اس کے بعد یہ معلوم رہنا چاہئے کہ اگر آپ اب میر صادق علی صاحب کے یہاں آئے تو پھر میرے یہاں آنا آپ کا غیر متیقّن ہے اور مولوی ابن حسن صاحب نونہروی کا بیان مجھے پسند رہا ہے اور وہ میرے مذاقِ طبع سے واقف ہو چکے ہیں۔''

یہ خط جو مجھے ملا تو اب نظام الدین صاحب کے یہاں کی مجالس میں جانے کا ارادہ تو میں نے فسخ کر دیا اس لئے کہ واقعی میری نظر میں اب اس میں بڑے خطرات تھے کیونکہ ایک محاذ مخالفت کا تو پہلے سے ایسا شدید قائم ہی ہو چکا تھا جیسا ہندوستان میں کہیں اب تک سامنے نہیں آیا تھا۔اب اس کے بعد بظاہر اسباب یقین تھا کہ اعلیٰ حضرت بھی انہی کا ساتھ دیں گے اور وہ اب والی ملک یا اس حیثیت کے بادشاہ نہ سہی مگر راج پرمکھ ہونے کی وجہ سے سربراہ ریاست تو اب بھی ہیں اور فوج اور پولیس ان کے اشارہ پر مصروف کار ہو سکتی ہے جب کہ اس کا بہانہ بہت نمایاں ہے یعنی مخالفین کے اقدامات کی بناء پر تحفظ امن۔۔۔۔۔پھر خود نظام الدین صاحب کا ملازم سرکاری ہونے کی وجہ سے پورا مستقبل ان کے ہاتھ میں ہے مگر جب نظام الدین کے یہاں نہیں جاؤں گا تو پھر حضور نظام سے تعلقات بھی قطع۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں نظام الدین صاحب کے یہاں نہ جاؤں اور حضور نظام کے یہاں جانے کا سلسلہ جاری رکھوں لہٰذا میں نے حضور نظام کے خط کا جواب لکھا اور کسی سے یہاں تک کہ گھر والوں سے اور اپنے بھائی باقر صاحب سلمہٗ تک سے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔اس لئے کہ وہ سب اس طرح کا جواب لکھنے سے مجھے یقین تھا کہ مانع ہوں گے۔

اس جواب کا مضمون حسب ذیل تھا:

''بجواب گرامی نامہ گزارش ہے کہ میں سرکار عالی کی اس تجویز سے متفق ہوں کہ جب تک شہید انسانیت کا دوسرا ایڈیشن طبع نہ ہو جائے میں حیدرآباد میں حاضر ہی نہ ہوں چنانچہ نظام الدین صاحب کو اپنی اس رائے کی اطلاع دے رہا ہوں۔ میری نسبت جو سرکار عالی کے مراحم چند سال سے رہے ہیں میں ان کا شکر گزار ہوں اور انھیں اپنے لئے کافی سمجھتے ہوئے مزید ہوس نہیں رکھتا ہوں۔ جب کہ جناب مولانا سید ابن حسن صاحب نونہروی کا بیان سرکار عالی کے مذاق طبع کے زیادہ مطابق ہوتا ہے تو میں سرکار اور ان کے درمیان حائل ہونا پسند نہیں کرتا''

میں نے اس مضمون کا خط بلا تأمل صاف کاغذ پر لکھ کر رجسٹری شدہ روانہ کر دیا اور یہ سمجھ لیا کہ بس اب حضور نظام سے تعلقات قطع ہو گئے۔

اس کے ساتھ نظام الدین صاحب کو بھی میں نے خط لکھ دیا کہ افسوس ہے کہ اب موجودہ حالات میں میں اس فیصلہ کے لئے مجبور ہو گیا ہوں کہ آپ کے یہاں مجالس میں حاضر نہ ہوں۔

جعفر شیروانی صاحب کا خط آیا تھا کہ آپ کب آ رہے ہیں؟ انھیں میں نے لکھا کہ ہر دو نظام کے تعارض کے سبب

سے اب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں اس سال حاضر نہ ہوں۔

حضور نظام نے یہ کیا کہ خود اپنے یہاں بسلسلۂ وفات سیدۂ عالم = مجالس کی بنا کردی اور ان میں بیان کے لئے مولانا ابن حسن صاحب نونہروی کو مدعو کیا۔ یہ خبر بھی مجھے ملی اور یہ بھی حسب توقع اس کی مظہر تھی کہ اب مجھ سے حضور نظام تعلقات قائم نہ رکھیں گے۔ نیز ''شیراز'' میں ''شہید انسانیت'' کے خلاف انتقادی مضامین حضور نظام کی طرف سے شائع ہونے کا سلسلہ شروع ہوگیا جن میں مجھ پر تعریضات بھی ہوتے تھے۔

نظام الدین صاحب نے میرے خط کے جواب میں کوئی خط نہ بھیجا۔ اس سے میرے ذہن میں یہ خطرہ تھا کہ کہیں وہ خود حیدرآباد سے لکھنؤ آنہ جائیں اور پھر چونکہ اصولاً تو میں ان کا حق سمجھتا ہوں۔ یہ فیصلہ تو میں نے اضطراری حالات کی وجہ سے کیا ہے تو اگر وہ آگئے تو مجھے جانے کے لئے مجبور ہونا پڑے گا مگر یہ خطرہ بس ایک ''اندیشۂ فردا'' کی حیثیت رکھتا تھا۔ ابھی بظاہر حالات یہی طے تھا کہ مجھے حیدرآباد جانا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اب مجالس کی تاریخوں میں صرف تین چار دن رہ گئے۔

میں شاید یونیورسٹی سے واپسی میں امین آباد سے چوک کے لئے بس میں بیٹھا اور بس چلنے کے قریب تھی کہ ایک دفعہ نظام الدین صاحب جھپٹتے ہوئے اسی بس کی طرف آئے اور تیزی کے ساتھ ٹکٹ لے کر بس میں داخل ہوئے۔ بیٹھنے کے بعد مڑ کر جو دیکھا تو میں اسی بس میں موجود تھا۔ بس اب ان کی عجیب کیفیت تھی۔ معلوم ہوا وہ ابھی حیدرآباد سے آکر لکھنؤ پہنچے اور راج پاک ویو ہوٹل میں جو امین آباد ہی میں ہے، سامان رکھا اور بس فوراً میرے پاس پہنچنے کی دھن میں آکر بس پر بیٹھے۔ چونکہ وہ دور تھے اس لئے اب راستے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہم دونوں بس سے جب اترے تو وہ میرے ساتھ ساتھ میرے مکان پر آئے۔ میں نے ان کی صورت دیکھ کر ہی سمجھ لیا تھا کہ اب حیدرآباد جانا ہے لہٰذا بیٹھنے کے بعد میں نے ان سے بس اتنا کہا کہ کیا آپ چھوڑیں گے نہیں؟ اور انھوں نے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے کہا کہ ''نہیں! قبلہ کبھی نہیں۔'' بس اب میں نے کچھ نہیں کہا اور تفصیلات پوچھنے لگا کہ کب جانا ہوگا اور کس طرح؟ ---ہاں باقر (میرے چھوٹے بھائی) نے ان سے بحث شروع کردی اور ایک ایک کرکے جو جو خطرے تھے پیش کرنے لگے مگر ہر بات کے لئے ان کا جواب ایک تھا اور وہ یہ کہ ''ہم امید کرتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوگا اور اگر ہوگا تو پھر دیکھا جائے گا۔'' میں نے اس بحث سے کوئی دلچسپی نہیں لی، اس لئے کہ میں تو طے کر چکا تھا کہ اب مجھے جانا ہے۔

احتیاطی تدبیر اس دفعہ صرف یہ اختیار کی کہ وہ جو مجلس کے انتظامات کے لئے قبل سے روانہ ہو جائیں مگر پھر تاریخ معین پر موٹر کے ساتھ میرے لینے کو قاضی پیٹھ آجائیں اور وہاں سے مجھے لے جائیں۔ چنانچہ یہ طے پاگیا اور نظام الدین صاحب اسی دن واپس گئے۔

میں ۸/جمادی الاول کو روانہ ہوا تاکہ ۱۱/کو پہنچ جاؤں۔ باقر صاحب سلمہٗ میرے ساتھ گئے۔ یہاں تک

کہ قاضی پیٹھ پہنچ گئے۔ قاضی پیٹھ میں حسب وعدہ نظام الدین صاحب موجود تھے۔ موٹر پر حیدر آباد پہنچے۔ اس دفعہ اندیشہ تھا کہ مخالف محاذ بڑا شدید ہوگا مگر معلوم ہوا کہ یہ قدرت الٰہی کا ایک کرشمہ تھا۔ مخالفین اب کی غافل رہے اور کوئی تنظیم اپنی انھوں نے نہ کی اس تصور میں کہ اب کی تو حضور نظام روکیں گے اور یہاں حضور نظام پر میرے خط کے پہنچنے اور پھر میرے نظام الدین صاحب کے یہاں جانے کا اثر اُلٹا پڑا جس کی پہلی علامت تو یہ تھی کہ مجلسیں مثل سابق الاوہ سرطوق میں ہوسکیں۔ بات یہ ہے کہ پولیس ایکشن کے بعد اس خیال سے کہ اب عوام بلکہ سابق رؤساء کی بھی اقتصادی حالت خراب ہوگئی ہے، حضور نظام نے تمام عزاخانوں اور درگاہوں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تا کہ ان کی بقاء وتحفظ کا سامان ہوسکے چنانچہ الاوہ سرطوق کی نگرانی اعلیٰ حضرت کے ذمہ ہے، اس لئے بغیر ان کی اجازت کے یہاں کوئی مجلس نہیں ہوسکتی۔

نظام الدین صاحب جب کہ ان کی ممانعت کے باوجود مجلسیں کررہے ہیں تو سب سے زیادہ مشکل مسئلہ ان کے لئے جگہ کا تھا چنانچہ وہ یہ طے کئے ہوئے تھے کہ وہاں اجازت نہ ملی تو میں کہیں اور مثلاً کاشانۂ خورشید میں کروں گا اور کوئی جگہ نہ ملی تو اپنے گھر میں کروں گا مگر مجھ سے لکھنؤ میں یہ اطمینان حاصل کرنے کے بعد کہ میں آؤں گا اب نظام الدین صاحب جو حیدر آباد واپس گئے تو پہلا کام یہ کیا کہ نذری باغ یعنی اعلیٰ حضرت کی ڈیوڑھی پر گئے اور کوتوال حبیب محمد صاحب کے ذریعہ سے اطلاع کرائی کہ نظام الدین آیا ہے۔ حضور نظام نے کہا کام پوچھو! انھوں نے کہا میری مجلسوں کا زمانہ آگیا ہے اور وہ الاوہ سرطوق میں ہوتی ہیں۔ اس کی اجازت حاصل کرنے آیا ہوں۔ بس اس پر جو جواب ملا اسی سے حضور نظام کے پورے تاثرات کا پتہ چل جائے گا۔ اندیشہ تو یہ تھا کہ بہت سخت جواب ملے گا مگر وہاں سے یہ کہا گیا کہ مجلسوں میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی؟ نظام الدین صاحب نے کہا خدا سے امید ہے کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا: ''بچے سے کہہ دو کہ اپنی ذمہ داری پر مجلسیں کرے۔'' حبیب محمد نے آکر یہ جواب سنا دیا۔ نظام الدین صاحب نے کہا مجھے تو اجازت تحریری درکار ہے۔ حبیب محمد نے کہا ارے اسے غنیمت سمجھو۔ آگے کچھ نہ کہو۔ انھوں نے کہا واہ! لوگوں کو تو عام طور پر یہ معلوم ہے کہ اعلیٰ حضرت ناراض ہیں۔ وقت پر کسی نے آکر روکا اور پوچھا کہ تم کس حق سے یہاں مجلسیں کررہے ہو تو میرے پاس کیا جواب ہوگا؟ حبیب محمد صاحب نے کہا اچھا اس وقت چلے جاؤ۔ پھر طلب اجازت کے لئے تحریراً معروضہ بھیجنا تو اجازت تحریراً بھی ہوجائے گی۔ نظام الدین صاحب خوش خوش واپس ہوئے۔ اعلان تو مجالس کا اسی وقت سے شروع کردیا۔ پھر دوسرے دن باقاعدہ معروضہ لکھ کر لے گئے تو اس پر اعلیٰ حضرت نے اپنے قلم سے تحریر کردیا کہ ''یہ نظام الدین کی مجلسیں ہر سال الاوہ سرطوق میں خود ان کے خرچ سے ہوتی ہیں، اس مرتبہ بھی ہوں گی۔''

اس طرح ہمیشہ کے واسطے سند ہوگئی۔ جب میں پہنچا اور یہ حالات معلوم ہوئے تو جو خطرات تھے ان سے تو اسی

وقت اطمینان ہوگیا۔ پھر دوسرے دن رسالہ ''شیراز'' آیا جس میں اعلیٰ حضرت کے بیانات اور مضامین شائع ہوتے تھے تو اس میں جلی حروف میں اعلیٰ حضرت کا بیان شائع ہوا کہ کچھ لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ مجھے سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ کی طرف سے کچھ تکدّر پیدا ہوگیا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے بلکہ میری نظر میں ان کا مثل سابق احترام ہے اور ان مجالس میں جو ان کے بیانات کے لئے ہو رہی ہیں کسی قسم کی بدمزگی پیدا ہو، اسے میں سخت ناپسند کرتا ہوں اور میرے یہاں ڈیوڑھی میں ۱۶ر جمادی الاول کو متّی مجلس جو انھوں نے پڑھی تھی اگر انھوں نے پڑھنا پسند کی تو میرا عین مقصد ہوگا۔'' یہ آخری الفاظ پتہ دیتے ہیں کہ خود خفا ہونے کے بجائے اب انھیں اندیشہ تھا کہ میں خفا ہوگیا ہوں گا۔

بہرحال اس دفعہ چونکہ خود ان کے یہاں مجلسیں ہو رہی تھیں جن میں مولانا ابن حسن صاحب نونہروی پڑھ رہے تھے تو وہ یہاں ہمارے یہاں مجلس میں شرکت کے لئے تشریف نہیں لائے۔ تاہم شہید یار جنگ کو میرے پاس بھیجا گیا وہ دیر تک بیٹھے رہے جیسے کہ یہ اندازہ کر رہے ہوں کہ مجھ میں کوئی برہمی تو نہیں ہے۔ جب انھیں میری باتوں سے اطمینان حاصل ہوگیا تو انھوں نے پیغام پہنچایا کہ اعلیٰ حضرت چاہتے ہیں کہ حضرت خاتونِ جنت سلام اللہ علیہا کے سلسلہ کی آخری مجلس ۱۵ر جمادی الاول کو آپ بڑی ڈیوڑھی میں پڑھیں اور ۱۶ر کو متّی مجلس سہ پہر کو قرن ولا میں جو آپ ہر سال پڑھتے ہیں۔ میں نے بلا تکلف وعدہ کرلیا۔ بس ۱۵ر کی مجلس کے لئے یہ کہا کہ چونکہ بعد مغرب خود نظام الدین صاحب کے یہاں مجھے پڑھنا ہوگا اس لئے مغرب کے وقت سے پہلے مجھے فرصت ہوجانا چاہئے۔ انھوں نے کہا اعلیٰ حضرت کو خود اس کا خیال ہے چنانچہ ۱۵ر کو تقریباً ۵ بجے موٹر آ گیا۔ میں پہنچا۔ مولانا ابن حسن صاحب نونہروی ابھی حیدرآباد میں موجود تھے۔ اس لئے ان کے پاس بھی شرکت مجلس کے لئے موٹر گئی۔ اور وہ بھی تشریف لائے۔

اب حضور نظام کو جیسے فکر تھی کہ میرے تکدّر کو دور کریں چنانچہ اب کی خصوصیات میں بہت اضافہ کردیا۔ امام باڑے میں داخل ہوتے ہی علم مبارک کو بوسہ دینے اور شمعیں روشن کرنے کے بعد جو ان کا ہمیشہ کا طریقہ تھا میری طرف آئے، جب سلامت کے ساتھ مصافحہ کیا اور پھر تمام شاہزادوں اور خانہ زادوں کی طرف مڑکر حکم ہوا کہ مولوی صاحب کو سلام کرو۔ سب نے عربی طریقہ سے سینہ پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا جو خود اعلیٰ حضرت کے بھی سلام کا انداز تھا۔ اس کے بعد مرثیہ پڑھے جانے کے بعد مجھے جب اشارہ ہوا اور میں منبر پر گیا تو کہا ''صلوات'' اور پھر حاضرین کو مخاطب کرکے کہا کہ ''بہت غور سے سنو! آج ایک مجتہد زیب منبر ہیں۔''

یہ باتیں مولانا ابن حسن صاحب کو بہت ناگوار ہوئیں اور ناگوار ہونا چاہئے تھیں مگر میرا ان میں کوئی اختیار نہ تھا۔ میرا حسب دستور مختصر بیان ہوا اور اعلیٰ حضرت دل کھول کر تعریف کرتے رہے۔ مجلس ختم ہوتے ہوتے مغرب کا وقت قریب ہوگیا۔ اب نوحہ خوانی وغیرہ ہونا تھی۔ اس لئے اگر اس سب میں میری شرکت ہوتی تو مغرب کا وقت وہیں ہوجاتا مگر اعلیٰ حضرت کو نظام الدین کے یہاں کی مجلس کا خیال تھا

لہٰذا بس میرا بیان ختم ہونے کے بعد ہی نوحہ خوانی سے پہلے حبیب محمد صاحب کو ارشاد ہوا کہ مولانا صاحب کو لے جاؤ آپ کو دوسری مجلس پڑھنا ہے۔ میں مغرب کے وقت جائے قیام پر پہنچ گیا اور بعد مغرب وقت معین پر نظام الدین صاحب کے یہاں کی مجلس ہوئی۔

دوسرے سال پھر مولوی ابن حسن صاحب نہیں بلائے گئے مگر اب مجالس سیدہ عالم کی بنا پڑ چکی تھی لہٰذا اب کی تین مجلسیں وہ مجھ ہی کو پڑھنا پڑیں اسی صورت سے کہ سہ پہر کو مجلس ہوتی تھی اور مجلس پڑھنے کے بعد فوراً میں آجاتا تھا اور نماز مغربین کے بعد نظام الدین صاحب کے یہاں کی مجلس پڑھتا تھا۔

آخری دن ۱۶ رجمادی الاولیٰ کو حسب دستور قدیم قرن ولا میں متقی مجلس ہوئی اور اب جناب شہید صاحب میرے پاس یہ پیغام لائے کہ ہر سال ۱۳ رجب، عید غدیر اور ۲۱ ررمضان میں اعلیٰ حضرت کے یہاں بیان کرنا ہوگا۔ میں اسی وقت سمجھتا تھا کہ اتنا بار یونیورسٹی کی پابندی کی وجہ سے میں برداشت نہیں کرسکتا مگر اس وقت انکار کرنا میں نے مناسب نہ سمجھا چنانچہ ۲ سال ۲۱ ر ماہ صیام میں بھی لکھنؤ سے حیدرآباد گیا مگر پھر میں نے معذرت کرلی اور دو ایک دفعہ ۱۳ ررجب کو بھی ناغہ کردیا گویا میں نے اعلیٰ حضرت کو انکار سننے کا عادی بنا دیا۔ اب انھوں نے طریقہ یہ اختیار کرلیا تھا جس پر آخر وقت تک قائم رہے کہ کسی بات کو مجھ سے بطور فرمائش نہ کہتے تھے بلکہ استفسار کرتے تھے خواہ زبانی اور خواہ تار سے کہ کیا آپ اس پروگرام کے مطابق آسکتے ہیں کہ فلاں تاریخ آیئے اور فلاں تاریخ واپس جایئے اور اتنے دن قیام کیجئے اس کے جواب میں اگر مجھے عمل کرنا ہے تو اقرار کرتا تھا اور اگر کوئی مجبوری ہے تو انکار کردیتا تھا جس پر وہ پھر کوئی اصرار نہیں کرتے تھے۔

آخر میں پھر ایک منزل ایسی آئی کہ تقریباً دو برس میں سمجھتا رہا کہ اب حضور نظام سے قطع تعلق ہوگیا مگر پھر میرا خیال غلط ثابت ہوا اور وہ خفا نہیں ہوئے۔

واقعہ یہ ہے کہ اب سے تین برس پہلے ایک دفعہ وہ نمونیا میں مبتلا ہوئے تو اس کے بعد کچھ تو واقعی کمزور زیادہ ہوگئے تھے اور کچھ ان لوگوں نے جو مجلس وغیرہ کو ناپسند کرتے تھے انھیں یہ تصور پیدا کردیا کہ اب آپ مجالس وغیرہ میں بیٹھ نہیں سکتے چنانچہ غدیر میں مجھے بلایا اور میں تین دن رہا مگر محفل کوئی نہیں ہوئی۔ صرف ایک دن ملاقات کی اور بس۔ پھر نظام الدین صاحب کے یہاں میں گیا تو بھی مجلس کوئی نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ متّقی مجلس جس کے متعلق خیال تھا کہ یہ متّقی ہونے کی وجہ سے ٹل ہی نہیں سکتی وہ بھی نہیں ہوئی۔ حالانکہ نوازشیں ان کی میرے ساتھ جو ہوتی تھیں بالکل وہی ہوئیں مگر میرے لئے یہ بارِ خاطر ہوا کہ جب کام کوئی نہیں تو اتنی زیر باری کے ساتھ میرے بلانے کے معنی کیا ہیں؟ پھر بھی سچی بات یہ ہے کہ یہ بس بارِ خاطر ہی رہتا اور اس بات پر میں جانے سے انکار نہ کرتا مگر ہوا یہ کہ اس مرتبہ جب نظام الدین صاحب کے یہاں جانے کے لئے میں نے رخصت کی درخواست دی تو اس موقع پر رجسٹرار آفس سے رپورٹ آتی ہے کہ اب کتنے دن چھٹی کے

باقی ہیں۔ معلوم ہوا کہ میری رعایتی چھٹی کے صرف تیرہ دن ہیں۔ اب دس دن کی چھٹی میں نظام الدین صاحب کے یہاں کے لئے لے رہا ہوں تو پھر دو مہینے کے بعد ۱۳؍رجب میں میرے حیدرآباد کے سفر کے لئے تین ہی دن رہ جاتے ہیں۔ تین دن میں یہ سفر کہاں ہوسکتا ہے تو اب انحصار ہے کہ یا میں نظام الدین صاحب کے یہاں جاؤں تو حضور نظام کے یہاں رجب میں نہیں جاسکتا اور یا اس وقت نہ جاؤں اور رجب ہی میں جاؤں۔ بس میں نے نظام الدین صاحب کو ترجیح دی اور اسی وقت طے کیا کہ اب کی حضور نظام کے یہاں نہیں جاؤں گا چنانچہ نظام الدین صاحب کے یہاں کے قیام میں جب وہاں ملاقات کے لئے گیا تو اسی وقت میں نے کہہ دیا کہ اب کی میرا حاضر ہونا ۱۳؍رجب میں مشکل ہے کیونکہ ہمارے یہاں یونیورسٹی میں خود علی ڈے ہوگا۔ بات تو صحیح ہی تھی۔ یونیورسٹی میں علی ڈے ہونا ہی تھا مگر اتنی بات ہے کہ اگر حیدرآباد جانا میرے مدنظر ہوتا تو علی ڈے کی تاریخ اس کے بعد رکھی جاتی۔ اب چونکہ مجھے حیدرآباد جانا نہیں تھا، اس لئے ۱۳؍رجب ہی کو علی ڈے کی تاریخ رکھی گئی۔ اس طرح میں ۱۳؍رجب کو نہیں گیا اور چونکہ اب رجب کے شروع میں میں نے پھر اپنی معذوری کی اطلاع دی تھی اس کے جواب میں تار آیا کہ اچھا اب آپ غدیر کے موقع پر آیئے گا چنانچہ میرا ارادہ تھا بھی کہ غدیر کے موقع پر جاؤں گا۔ مگر انہی تاریخوں میں دینیات کے امتحان پڑ گئے اور ایک تاریخ میں وایوا ووسی (زبانی امتحان) پڑ گیا جس میں میری موجودگی ضروری تھی۔ پھر بھی میں نے حیدرآباد کے پروگرام کے انجام پانے کی ایک کوشش کی۔ چونکہ یہ حضور نظام کے یہاں کا ایک عام طریقہ رہا ہے کہ پروگرام کی اطلاع بس عین وقت پر تار سے دی جاتی تھی لہٰذا ہر مرتبہ غدیر میں جو دستور تھا کہ میرا تین دن حیدرآباد میں قیام ہوتا تھا اس لحاظ سے میں نے رجسٹرار کو لکھا کہ وایوا ووسی (Viva voce) کی تاریخ دو دن پیچھے ہٹا دی جائے چنانچہ رجسٹرار صاحب نے میری خواہش پر اسے ہٹا بھی دیا۔ اور مجھے اطلاع دے دی مگر اب حیدرآباد سے جو تار آیا تو اس میں اس مرتبہ تین دن کے بجائے پانچ دن کے پروگرام کے لئے لکھا تھا۔ اب مجھے یہ بالکل نامناسب معلوم ہوا کہ ایک دفعہ تو میرے کہنے سے تاریخ وایوا ووسی (Viva voce) کی بڑھائی جاچکی ہے اور میری بتائی ہوئی تاریخ معین کی گئی ہے اور اب میں پھر اس تاریخ کے بدلنے کو لکھوں لہٰذا مجبوراً میں نے تار کا جواب بھیج دیا کہ امتحانات کی وجہ سے نہیں آسکتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سال میں کسی بھی موقع پر اعلیٰ حضرت کے یہاں نہیں گیا۔ اس کے بعد میں سمجھا کہ حضور نظام اس پر خفا ہوجائیں گے چنانچہ اس کے بعد جو نظام الدین صاحب کے یہاں گیا تو میں نے جناب نجم صاحب وغیرہ سے یہی خیال ظاہر کیا کہ اب وہاں سے میرے تعلقات قطع ہو چکے ہیں چنانچہ نظام الدین صاحب کے یہاں کے قیام میں اب مجلس تو وہاں سال گزشتہ بھی نہیں ہوئی تھی مگر اب کی ملاقات کے لئے بلاوا بھی نہیں آیا۔ اور پھر ۱۳؍رجب میں بھی کوئی تحریک نہیں ہوئی جس سے میرا تصور تقریباً پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا مگر پھر ثابت ہوا کہ نہیں۔ وہ خفا نہیں ہوئے چنانچہ پھر عید غدیر

کا موقع آیا تو وہاں سے پانچ دن کے لئے بلاوا آیا۔

اگر چہ بیان اب کی بھی کوئی نہیں ہوا۔ نہ محفل، نہ مجلس بس دو عقدوں میں شرکت تھی جس کے لئے مجھے مدعو کیا گیا تھا اور پھر بڑی لجاجت کے ساتھ ۱۷ ربیع الاول میں پرنس معظم جاہ بہادر کی لڑکی کے عقد میں (جس کی پیدائش کی متّتی مجلس میں پڑھتا ہوں) شرکت کے لئے مدعو کیا جو گرمی کی چھٹی میں پڑ رہا تھا لہٰذا مجھے شرکت میں کوئی دشواری بھی نہ تھی اور بس یہ آخری موقع ان کے یہاں جانے کا تھا اور آخری ملاقات تھی جس کے چند مہینے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کا انتقال اب بھی ایک شخص واحد کا دنیا سے اُٹھنا نہیں بلکہ ہزاروں آدمیوں کی زندگی کا ایک انقلاب ہے اور عزاداری وغیرہ کا حیدر آباد میں جتنا چرچا ان کے دم سے تھا وہ یقیناً اب ختم ہو گیا اور یہ ایک پہلوان کے کردار کا بہت حد تک ناقابل فہم رہا کہ عزاداری کے ساتھ اتنے شغف کے باوجود انھوں نے اپنے بعد کے لئے ان چیزوں کا انتظام ایسے ہاتھوں میں نہ دیا جو انھیں باقی رکھنے کا جذبہ رکھتے ہوں۔

اللہ ان کی نیت اور عمل ہر ایک سے باخبر ہے اور یقیناً وہ اس کے مطابق انھیں بہترین جزا عطا فرمائے گا۔

علی نقی النقوی ۲۰ر شوال ۱۳۸۶ھ (علی گڑھ)



بقیہ.....ضرورت واہمیت اتحاد

### انیس العصر سید ابن الحسین مہدی نظمی

حسینؑ کہتے ہیں جس کو وہ ایک ذات نہیں
وہ کائنات الٰہی ہے آدمی کے لئے
علم نشان تمنا ہے امن عالم کا
ضریح نقش محبت ہے دوستی کے لئے
امامباڑے نہیں ہیں یہ درسگاہیں ہیں
شعور حق کے لئے علم مجلسی کے لئے
در حسینؑ پہ ملتے ہیں ہر خیال کے لوگ
یہ اتحاد کا مرکز ہے آدمی کے لئے

### ساحر فیض آبادی (کراچی)

اتحاد عالم اسلام کی باتیں کرو
اے خطیبو! کچھ تو یارو کام کی باتیں کرو
جھانک لو اپنے گریبانوں میں بھی منہ ڈال کر
دوسروں پر جب کبھی الزام کی باتیں کرو
تذکرہ مولا علیؑ کا جب عبادت ہے تو پھر
کیا ضرورت ہے کہ میر شام کی باتیں کرو
ڈس نہ جائے نفرتوں کی تیرگی ماحول کو
صبح کی خاطر وداع شام کی باتیں کرو
نوع انساں سے محبت دین کی بنیاد ہے
مجلسوں میں دین کے احکام کی باتیں کرو
ایک ہوجائیں گے سب انسانیت کے نام پر
حضرت شبیرؑ کے پیغام کی باتیں کرو

(''کعبے سے کربلا تک'')

### قدر فیض آبادی

اتحاد باہمی سے کام لینا چاہئے
درس الفت صبح سے شام لینا چاہئے
فرقہ بندی کے صنم مل جل کے پہلے توڑ لو
تب تمہیں ختم الرسلؐ کا نام لینا چاہئے

### اسیف جائسی

ہے اگر توحید کو محبوب کچھ، تو اتحاد
وہ موحّد ہی نہیں جو متّحد ہوتے نہیں

(از ''دیوان اسیف'')